

○

تفسير القرآن

الكبير

(١٥)

الْحَجْرُ

نام آیت ۸۰ کے فقرے كَذَابٌ كَذِبٌ الْحَجْرِ الْمُرْسَلِينَ سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول مضامین اور اندازہ بیان سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ اس سورے کا زمانہ نزول سورہ ابراہیم سے متصل ہے۔ اس کے پس منظر میں دو چیزیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دیتے ایک مدت گزر چکی ہے اور مخاطب قوم کی مسلسل ہٹ دھرمی، استہزا، مزاحمت اور ظلم و ستم کی حد ہو گئی ہے، جس کے بعد اب تفسیم کا موقع کم اور تنبیہ و انداز کا موقع زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی قوم کے کفر و مجرور اور مزاحمت کے پھاڑ توڑتے توڑتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھکے جا رہے ہیں اور دل شکستگی کی کیفیت بار بار آپ پر طاری ہو رہی ہے، جسے دیکھ کر اللہ تعالیٰ آپ کو تسلی دے رہا ہے اور آپ کی ہمت بندھا رہا ہے۔

موضوع اور مرکزی مضمون ایسی دو مضمون اس سورے میں بیان ہوئے ہیں۔ یعنی تنبیہ اُبی لوگوں کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کر رہے تھے اور آپ کا مذاق اڑاتے اور آپ کے کام میں طرح طرح کی مزاحمتیں کرتے تھے۔ اور تسلی و ہمت افزائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سورہ تفسیم اور نصیحت سے خالی ہے۔ قرآن میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے مجرور تنبیہ، یا خالص مجرور توبیخ سے کام نہیں لیا ہے۔ سخت سے سخت دھمکیوں اور ملامتوں کے درمیان بھی وہ سمجھانے اور نصیحت کرنے میں کمی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس سورے میں بھی ایک طرف توحید کے دلائل کی طرف مختصر اشارے کیے گئے ہیں، اور دوسری طرف قصہ آدم و ابلیس بنا کر نصیحت فرمائی گئی ہے۔

آيَاتُهَا ۹۹ سُورَةُ الْحَجْرِ مَكِّيَّةٌ رُكُوعَاتُهَا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الَّذِیْ تِلْكَ آيٰتِ الْكِتٰبِ وَ قُرْآنٍ مُّبِیْنٍ ①

رُبَّمَا یُوَدُّ الذّٰلِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِیْنَ ②

ذَرَهُمْ یَاكُلُوْا وَ یَمْتَعُوْا وَ یُلْهَمُهُمُ الْاَمْلُ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ③

وَ مَا اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْیَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتٰبٌ مَّعْلُوْمٌ ④ مَا تَسْبِقُ

آل۔ ۲۔ یہ آیات ہیں کتاب الہی اور قرآن مبین کی۔

بغیر نہیں کہ ایک وقت وہ آجائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج (دعوت اسلام کو قبول کرنے سے) انکار کر دیا ہے پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے تسلیم خم کر دیا ہوتا۔ چھوڑ دیا نہیں۔ کھائیں پیئیں، مزے کریں اور بھلا دے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی۔ کوئی قوم

۱۔ یہ اس سورے کی مختصر تعارفی تمہید ہے جس کے بعد فوراً ہی اصل موضوع پر خطبہ شروع ہو جاتا ہے۔

قرآن کے لیے ”مبین“ کا لفظ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیات اس قرآن کی ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ مطلب یہ ہے کہ کفر کرتے ہی فوراً تو ہم نے کبھی کسی قوم کو بھی نہیں پکڑ لیا ہے، پھر یہ نادان لوگ کیوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نبی کے ساتھ تکذیب و استنزاء کی جو روش انہوں نے اختیار کر رکھی ہے اس پر چونکہ ابھی تک انہیں سزا نہیں دی گئی اس لیے یہ نبی سرے سے نبی ہی نہیں ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ ہم ہر قوم کے لیے پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ اس کو سننے، سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے اتنی مہلت دی جائے گی، اور اس حد تک اس کی شرارتوں اور خباثتوں کے باوجود پورے تحمل کے ساتھ اسے اپنی من مانی کرنے کا موقع دیا جاتا رہے گا۔ یہ مہلت جب تک باقی رہتی ہے اور ہماری مقرر کی ہوئی حد میں وقت تک انہیں جاتی، ہم ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ (مہلت عمل کی تشریح کے لیے

مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ⑤ وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي
 نَزَّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ⑥ لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَكَةِ
 إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ ⑦ مَا نُنزِّلُ الْمَلَكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا
 كَانُوا إِذَا مُنظَرِينَ ⑧ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ⑨

نہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں ”اے وہ شخص جس پر ذکر نازل ہوا ہے، تو یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے

تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتا؟“ — ہم فرشتوں کو یوں ہی نہیں اتار دیا کرتے۔ وہ

جب اترتے ہیں تو حق کے ساتھ اترتے ہیں، اور پھر لوگوں کو عملت نہیں دی جاتی۔ رہا یہ ذکر، تو

اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔

ملاحظہ ہو سورۃ ابراہیم حاشیہ نمبر ۱۸۔

۳۷ ”ذکر“ کا لفظ قرآن میں اصطلاحاً کلام الہی کے لیے استعمال ہوا ہے جو سراسر نصیحت بن کے آتا ہے۔

پہلے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل ہوئی تھیں وہ سب بھی ”ذکر“ تھیں اور یہ قرآن بھی ”ذکر“ ہے۔ ذکر کے اصل معنی ہیں ”یاد دلانا“

”ہوشیار کرنا“، اور ”نصیحت کرنا“

۳۸ یہ فقرہ وہ لوگ طنز کے طور پر کہتے تھے۔ اُن کو تو یہ تسلیم ہی نہیں تھا کہ یہ ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل

ہوا ہے۔ نہ اسے تسلیم کر لینے کے بعد وہ آپ کو دیوانہ کہہ سکتے تھے۔ دراصل اُن کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ”اے وہ شخص جس کا

دعویٰ یہ ہے کہ مجھ پر ذکر نازل ہوا ہے“ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی فرعون نے حضرت موسیٰ کی دعوت سننے کے بعد اپنے درباریوں

سے کہی تھی کہ ”إِن دَسُو لَكُمْ الذِّكْرَ أَرْسِلْ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونًا“، ”یہ پیغمبر صاحب جو تم لوگوں کی طرف بھیجے گئے

ہیں، ان کا دماغ درست نہیں ہے“

۳۹ یعنی فرشتے محض تماشا دکھانے کے لیے نہیں اتارے جاتے کہ جب کسی قوم نے کہا بلاؤ فرشتوں کو اور وہ

فوراً حاضر ہوئے۔ نہ فرشتے اس غرض کے لیے کبھی بھیجے جاتے ہیں کہ وہ اگر لوگوں کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کریں اور پردہ

غیب کو چاک کر کے وہ سب کچھ دکھادیں جس پر ایمان لانے کی دعوت انبیاء علیہم السلام نے دی ہے۔ فرشتوں کو بھیجنے کا وقت تو وہ



وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شَيْعِ الْأَوَّلِينَ ۝۱۰ وَمَا يَأْتِيهِمْ
مِّنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝۱۱ كَذَلِكَ نَسُكُّهُ فِي
قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۝۱۲ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةٌ

اے محمد! ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے پاس کوئی رسول آیا ہو اور انہوں نے اُس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ مجرمین کے دلوں میں تو ہم اس ذکر کو اسی طرح (سلاخ کے مانند) گزارتے ہیں۔ وہ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے۔ قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ

آخری وقت ہوتا ہے جب کسی قوم کا فیصلہ چکا دینے کا ارادہ کر لیا جاتا ہے۔ اُس وقت بس فیصلہ چکایا جاتا ہے، یہ نہیں کہا جاتا کہ اب ایمان لاؤ تو چھوڑ سے دیتے ہیں۔ ایمان لانے کی جتنی مہلت بھی ہے اسی وقت تک ہے جب تک کہ حقیقت بے نقاب نہیں ہو جاتی۔ اُس کے بے نقاب ہو جانے کے بعد ایمان لانے کا کیا سوال۔

”حق کے ساتھ اترتے ہیں“ کا مطلب ”حق لے کر اترنا“ ہے۔ یعنی وہ اس لیے آتے ہیں کہ باطل کو مٹا کر حق کو اس کی جگہ قائم کر دیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ لے کر آتے ہیں اور اسے نافذ کر کے چھوڑتے ہیں۔

۱۰ یعنی یہ ”ذکر“ جس کے لانے والے کو نم بختون کہہ رہے ہو، یہ ہمارا نازل کیا ہوا ہے، اس نے خود نہیں گھڑا ہے۔ اس لیے یہ گالی اس کو نہیں ہمیں دی گئی ہے۔ اور یہ خیال تم اپنے دل سے نکال دو کہ تم اس ”ذکر“ کا کچھ بگاڑ سکو گے۔ یہ براہ راست ہماری حفاظت میں ہے۔ نہ تمہارے مٹائے مٹ سکے گا، نہ تمہارے دبائے دب سکے گا، نہ تمہارے طعنوں اور اعتراضوں سے اس کی تھرگھٹ سکے گی، نہ تمہارے سدو کے اس کی دعوت رُک سکے گی، غاس میں تحریت اور رد و بدل کرنے کا کبھی کسی کو موقع مل سکے گا۔

۱۱ عام طور پر مترجمین و مفسرین نے نَسُكُّهُ کی ضمیر استنزاء کی طرف، اور لَا يُؤْمِنُونَ یہ کی ضمیر ذکر کی طرف پھیری ہے، اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ”ہم اسی طرح اس استنزاء کو مجرمین کے دلوں میں داخل کرتے ہیں اور وہ اس ذکر پر ایمان نہیں لاتے“ اگرچہ غوی قاعدے کے لحاظ سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن ہمارے نزدیک غوی کے اعتبار سے بھی زیادہ صحیح یہ ہے کہ دونوں ضمیریں کی طرف پھیری جائیں۔ سلاخ کے معنی عربی زبان میں کسی چیز کو دوسری چیز میں چلانے، گزارنے اور پروانے کے ہیں، جیسے تانگے کو سوئی کے ناکے میں گزارنا۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کے اندر تو یہ ذکر قلب کی ٹھنڈک اور روح کی غذا بن کر اترتا ہے، مگر مجرموں کے دلوں میں یہ شستا بن کر لگتا ہے اور ان کے اندر اسے سن کر ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے گویا کہ ایک گم سلاخ تھی جو سینے کے پار ہو گئی۔

الْأُولَىٰ ۝۱۳ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ
 يَعْرُجُونَ ۝۱۴ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكَّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ
 مَّسْحُورُونَ ۝۱۵ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا
 لِلنَّاظِرِينَ ۝۱۶ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ۝۱۷ إِلَّا مَنِ

چلا آ رہا ہے۔ اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دھاڑے اُس میں چڑھنے بھی
 لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔
 یہ ہماری کار فرمائی ہے کہ آسمان میں ہم نے بہت سے مضبوط قلعے بنائے ان کو دیکھنے والوں
 کے لیے مزین کیا، اور ہر شیطان مردود سے ان کو محفوظ کر دیا۔ کوئی شیطان ان میں راہ نہیں پاسکتا، الا یہ کہ

۵۸ بُرُج عربی زبان میں قلعے، قصر اور مستحکم عمارت کو کہتے ہیں۔ قدیم علم ہیئت میں ”برج“ کا لفظ اصطلاحاً ان
 بارہ منزلوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جن پر سورج کے مدار کو تقسیم کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا کہ قرآن کا
 اشارہ انہی برج کی طرف ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد ستارے لیے ہیں۔ لیکن بعد کے مضمون پر غور
 کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے مراد عالم بالا کے وہ خطے ہیں جن میں سے ہر خطے کو نہایت مستحکم سرحدوں نے دوسرے
 خطے سے جدا کر رکھا ہے۔ ساگر چہ یہ سرحدیں فضائے بسیط میں غیر مرئی طور پر کھچی ہوئی ہیں، لیکن ان کو پار کر کے کسی چیز کا ایک خطے سے
 دوسرے خطے میں چلا جانا سخت مشکل ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے ہم برج کو محفوظ خطوں Fortified spheres
 کے معنی میں لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔

۵۹ یعنی ہر خطے میں کوئی نہ کوئی روشن ستارہ یا نارا رکھ دیا اور اس طرح سارا عالم جگمگا اٹھا۔ بالفاظ دیگر ہم نے
 اس ناپیدیا کنار کائنات کو ایک بھیانک ڈھنڈا بنا کر نہیں رکھ دیا بلکہ ایک ایسی حسین و جمیل دنیا بنائی جس میں ہر طرف نگاہوں
 کو جذب کر لینے والے جلوے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا ریگری میں صرف ایک صنایع اکبر کی صنعت اور ایک حکیم اجل کی حکمت
 ہی نظر نہیں آتی ہے، بلکہ ایک کمال درجے کا پاکیزہ ذوق رکھنے والے آرٹسٹ کا آرٹ بھی نمایاں ہے۔ یہی مضمون
 ایک دوسرے مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے، اَلَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ السَّجْدَةَ - آیت ۷، ”وہ خدا کہ جس نے
 ہر چیز جو بنائی، خوب ہی بنائی۔“

۶۰ یعنی جس طرح زمین کی دوسری مخلوقات زمین کے خطے میں مقید ہیں اسی طرح شیاطین جن بھی اسی خطے میں

اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاتَّبَعَهُ نِشَابٌ مُّبِينٌ ﴿۱۸﴾

کچھ سُن گُن لے لے۔ اور جب وہ سُن گُن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلہ روشن اُس کا پھیا کرتا ہے۔

مقید ہیں، عالم بالانک اُن کی رسائی نہیں ہے۔ اس سے دراصل لوگوں کی اُس عام غلط فہمی کو دور کرنا مقصود ہے جس میں پہلے بھی عوام الناس مبتلا تھے اور آج بھی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیطان اور اس کی ذریت کے لیے ساری کائنات کھلی پڑی ہے، جہاں تک وہ چاہیں پرواز کر سکتے ہیں۔ قرآن اس کے جواب میں بتاتا ہے کہ شیاطین ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے، انہیں غیر محدود پرواز کی طاقت ہرگز نہیں دی گئی ہے۔

اللہ یعنی وہ شیاطین جو اپنے اولیاء کو غیب کی خبریں لا کر دینے کی کوشش کرتے ہیں، جن کی مدد سے بت سے کاہن، جوگی، عامل اور فقیر بنا ہو پیسے غیب دانی کا ڈھونگ رچایا کرتے ہیں، اُن کے پاس حقیقت میں غیب دانی کے ذرائع بالکل نہیں ہیں۔ وہ کچھ سُن گُن لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، کیونکہ اُن کی ساخت انسانوں کی بہ نسبت فرشتوں کی ساخت سے کچھ قریب تر ہے، لیکن فی الواقع اُن کے پتے کچھ پڑتا نہیں ہے۔

اللہ ”شہابِ مبین“ کے لغوی معنی ”شعلہ روشن“ کے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کے لیے ”شہابِ ثاقب“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی ”تاریکی کو چھیدنے والا شعلہ“۔ اس سے مراد ضروری نہیں کہ وہ ٹوٹنے والا تارہ ہی ہو جسے ہماری زبان میں اصطلاحاً شہابِ ثاقب کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اور کسی قسم کی شعاعیں ہوں، مثلاً کائناتی شعاعیں (Cosmic Rays) بیان سے بھی زیادہ شدید کوئی اور قسم جو ابھی ہمارے علم میں نہ آئی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی شہابِ ثاقب مراد ہوں جنہیں کبھی کبھی ہماری آنکھیں زمین کی طرف گرتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ زراعتِ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دورِ بین سے دکھائی دینے والے شہابِ ثاقب جو فضا سے بیٹھتے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، اُن کی تعداد کا اوسط ۱۰ کھرب روزانہ ہے، جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے۔ اُن کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۰ میل فی سکند ہوتی ہے اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سکند تک دیکھی گئی ہے۔ بار بار ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے۔ چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۲ نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکہ کے مشرقی علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر صبح تک ۲ لاکھ شہابِ ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے۔ انسانی کلور پیڈیا یا برٹانیکا ۱۹۲۶ء۔ جلد ۱۵۔ ۲۹-۳۲)۔ ہو سکتا ہے کہ یہی بارش عالم بالائی طرف شیاطین کی پرواز میں مانع ہوتی ہو، کیونکہ زمین کے بالائی حدود سے گزر کر فضا سے بیٹھنے والے تاروں کے اوسط سے ٹوٹنے والے تاروں کی برسات اُن کے لیے اس فضا کو بالکل ناقابلِ عبور بنا دیتی ہوگی۔

اس سے کچھ اُن ”محفوظ نفلوں“ کی نوعیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بظاہر فضا بالکل صاف

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ ۝۱۹ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرِزْقَيْنَ ۝۲۰ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنزِلُ

ہم نے زمین کو پھیلایا، اُس میں پہاڑ جمائے، اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک پنی تلی مقدار کے ساتھ آگائی، اور اس میں معیشت کے اسباب فراہم کیے، تمہارے لیے بھی اور ان بہت سی مخلوقات کے لیے بھی جن کے رازق تم نہیں ہو۔

کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں

شفاف ہے جس میں کہیں کوئی دیوار یا چھت بنی نظر نہیں آتی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی فضا میں مختلف خطوں کو کچھ ایسی غیر مرئی فصیلوں سے گھیر رکھا ہے جو ایک خطے کو دوسرے خطوں کی آفات سے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ انہی فصیلوں کی برکت ہے کہ جو شہاب ثاقب دس کھرب روزانہ کے اوسط سے زمین کی طرف گرتے ہیں وہ سب جل کر بھسم ہو جاتے اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔ دنیا میں شہابی پتھروں (Meteorites) کے جو نمونے پائے جاتے ہیں اور دنیا کے عجائب خانوں میں موجود ہیں ان میں سب سے بڑا ۶۴۵۱ پونڈ کا ایک پتھر ہے جو گر کر اٹلیٹ زمین میں دھنس گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مقام پر ۳۶ ٹن کا ایک آہنی ٹودہ پایا گیا ہے جس کے وہاں موجود ہونے کی کوئی توجیہ سائنس داں اس کے سوا نہیں کر سکے ہیں کہ یہ بھی آسمان سے گرا ہوا ہے۔ قیاس کیجیے کہ اگر زمین کی بالائی سرحدوں کو مضبوط حصاروں سے محفوظ نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان ٹوٹے والے تاروں کی بارش زمین کا کیا حال کر دیتی۔ یہی حصار ہیں جن کو قرآن مجید نے ”بروج“ (محفوظ قطعوں) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

۱۵ اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے ایک اور اہم نشان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ نباتات کی ہر نوع میں خناسل کی اس قدر زبردست طاقت ہے کہ اگر اس کے صرف ایک پودے ہی کی نسل کو زمین میں بڑھنے کا موقع مل جاتا تو چند سال کے اندر روئے زمین پر بس وہی وہ نظر آتی، کسی دوسری قسم کی نباتات کے لیے کوئی جگہ نہ رہتی۔ مگر یہ ایک حکیم اور قادر مطلق کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس کے مطابق بے حد و حساب اقسام کی نباتات اس زمین پر آگ رہی ہیں اور ہر نوع کی پیداوار اپنی ایک مخصوص حد پر پہنچ کر روک جاتی ہے۔ اسی منظر کا ایک اور پلویہ ہے کہ ہر نوع کی جسامت، پھیلاؤ، اٹھان اور نشوونما کی ایک حد مقرر ہے جس سے نباتات کی کوئی قسم بھی تجاوز نہیں کر سکتی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ہر درخت، ہر پلویہ اور ہر نیل بوٹے کے لیے حجم، قد، شکل، برگ و بار اور پیداوار کی ایک مقدار پر پورے ناپ تول اور حساب و شمار کے ساتھ

إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝۲۱ وَ أَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ
مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ ۝۲۲ وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي
وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ۝۲۳ وَ لَقَدْ عَلَّمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ
عَلَّمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ۝۲۴ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝۲۵

ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

بار آور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں، اور اس پانی سے تمہیں
سیراب کرتے ہیں۔ اس دولت کے خزانہ دار تم نہیں ہو۔

زندگی اور موت ہم دیتے ہیں، اور ہم ہی سب کے وارث ہونے والے ہیں۔ پہلے جو لوگ تم میں سے ہو گئے
ہیں ان کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے، اور بعد کے آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔ یقیناً تمہارا رب
ان سب کو اکٹھا کرے گا، وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی۔

مقرر کر رکھی ہے۔

۱۲۔ یہاں اس حقیقت پر متنبہ فرمایا کہ یہ معاملہ صرف نباتات ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام موجودات
کے معاملہ میں عام ہے۔ ہوا، پانی، روشنی، گرمی، سردی، جمادات، نباتات، حیوانات، غرض ہر چیز، ہر نوع ہر جنس،
اور ہر قوت و طاقت کے لیے ایک حد مقرر ہے جس پر وہ ٹھہری ہوئی ہے اور ایک مقدار مقرر ہے جس سے نہ وہ گھٹی
ہے نہ بڑھتی ہے۔ اسی تقدیر اور کمال درجہ کی حکیمانہ تقدیر ہی کا یہ کہنہ ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک پورے نظام
کائنات میں یہ توازن، یہ اعتدال، اور یہ تناسب نظر آ رہا ہے۔ اگر یہ کائنات ایک اتفاقی حادثہ ہوتی، یا بہت سے خداؤں
کی کاریگری و کارفرمائی کا نتیجہ ہوتی تو کس طرح ممکن تھا کہ بے شمار مختلف اشیاء اور قوتوں کے درمیان ایسا مکمل توازن و
تناسب قائم ہوتا اور مسلسل قائم رہ سکتا؟

۱۵۔ یعنی تمہارے بعد ہم ہی باقی رہنے والے ہیں۔ تمہیں جو کچھ بھی ملا ہوا ہے محض عارضی استعمال کے لیے
ملا ہوا ہے۔ آخر کار ہماری دی ہوئی ہر چیز کو یونہی چھوڑ کر تم خالی ہاتھ رخصت ہو جاؤ گے اور یہ سب چیزیں جو ان کی توں ہمارے
خزانے میں رہ جائیں گی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿۲۶﴾
 وَالْبَحَّاءَ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ تَارِ السَّمُومِ ﴿۲۷﴾ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ
 لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿۲۸﴾
 فَإِذَا سَوَّيْتَهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ سُرُورٍ فَقَعُوْا لَهُ سُجَّدًا ﴿۲۹﴾

ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا۔ اور اس سے پہلے جنوں کو ہم
 آگ کی لپٹے پیدا کر چکے تھے۔ پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ
 ”میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اسے پورا بنا
 چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا“

۱۶ یعنی اس کی حکمت یہ تھا کرتی ہے کہ وہ سب کو اکٹھا کرے اور اس کا علم سب پر اس طرح حاوی ہے کہ کوئی
 متنفس اس سے چھوٹ نہیں سکتا، بلکہ کسی اگلے پچھلے انسان کی خاک کا کوئی ذرہ بھی اس سے کم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو شخص
 حیاتِ اخروی کو مستبعد سمجھتا ہے وہ خدا کی صفتِ حکمت سے بے خبر ہے، اور جو شخص حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ ”جب مرنے کے بعد
 ہماری خاک کا ذرہ ذرہ منتشر ہو جائے گا تو ہم کیسے دوبارہ پیدا کیے جائیں گے“ وہ خدا کی صفتِ علم کو نہیں جانتا۔

۱۷ یہاں قرآن اس امر کی صاف تصریح کرتا ہے کہ انسان حیوانی منازل سے ترقی کرتا ہوا بشریت کے حدود میں
 نہیں آیا ہے، جیسا کہ نئے دور کے فارغیت سے متاثر مفسرین قرآن ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، بلکہ اس کی تخلیق کی
 ابتدا براہِ راست ارضی مادوں سے ہوئی ہے جن کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ کے الفاظ میں
 بیان فرمایا ہے۔ حمأ عربی زبان میں ایسی سیاہ کچھڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر بوب پیدا ہو چکی ہو، یا بالفاظ دیگر خمیر اٹھا آیا ہو۔
 مسنون کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی میں منغیر، مندن اور املس، یعنی ایسی سڑی ہوئی جس میں سڑنے کی وجہ سے
 چکنائی پیدا ہو گئی ہو۔ دوسرے معنی میں مصوس اور مصبوب، یعنی قالب میں ڈھلی ہوئی جس کو ایک خاص صورت
 دے دی گئی ہو۔ صَلْصَالٍ اس سوکھے گارے کو کہتے ہیں جو خشک ہو جانے کے بعد بجنے لگے۔ یہ الفاظ صاف ظاہر
 کرتے ہیں کہ خمیر اٹھی ہوئی مٹی کا ایک پتلا بنا یا گیا تھا جو بننے کے بعد خشک ہوا اور پھر اس کے اندر روح پھونکی گئی۔

۱۸ سَمُومِ گرم ہوا کو کہتے ہیں، اور نار کو سموم کی طرف نسبت دینے کی صورت میں اس کے معنی آگ کے
 بجائے تیز حرارت کے ہو جاتے ہیں۔ اس سے ان مقامات کی تشریح ہو جاتی ہے جہاں قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے

فَبَعَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ﴿۳۰﴾ إِلَّا إِبْلِيسَ ابْنَىٰ أَنْ يَكُونَ مَعَ
الشَّيْطَانِ ﴿۳۱﴾ قَالَ يَا بَلِيسُ مَا لَكَ إِلَّا تَكُونَ مَعَ الشَّيْطَانِ ﴿۳۲﴾
قَالَ لَمْ أَكُنْ لِأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمِيمٍ

چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ اُس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ رب نے پوچھا "اے ابلیس، تجھے کیا ہوا کہ تُو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا؟" اس نے کہا "میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی کی مٹی کے سُوکھے

کہ جن آگ سے پیدا کیے گئے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو حوالہ حلقہ، حواشی ۱۶ تا ۱۷)

۱۹ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر جو روح پھونکی گئی ہے وہ دراصل صفاتِ الہی کا ایک عکس یا پرتو ہے جیات، علم، قدرت، ارادہ، اختیار، اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں، جن کے مجموعہ ہی کا نام روح ہے، یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو اس کا لہرِ خاکی پر ڈالا گیا ہے، اور اسی پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔

یوں تو ہر وہ صفت جو مخلوقات میں پائی جاتی ہے، اس کا مصدر و منبع اللہ تعالیٰ ہی کی کوئی نہ کوئی صفت ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جَعَلَ اللَّهُ الرَّحْمَةَ يَأْتِي جُزْءًا فَمَا مَكَ عِنْدَهُ تِسْعَةٌ وَتِسْعِينَ وَأَنْزَلَ فِي الْأَرْضِ جُزْءًا وَاحِدًا فَمِنْ ذَلِكَ الْجُزْءِ يَكُونُ أَحْمُ الْخَلَائِقِ حَتَّى تَرْفَعُ الدَّابَّةُ حَافِرَهَا عَنْ وَكْدِهَا خَشْيَةً أَنْ تُصِيبَهُ (بخاری و مسلم) اللہ تعالیٰ نے رحمت کو سو حصوں میں تقسیم فرمایا، پھر ان میں سے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھا اور صرف ایک حصہ زمین میں اتارا۔ یہ اُسی حصے کی برکت ہے جس کی وجہ سے مخلوقات آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر ایک جانور اپنے پیچھے سے اپنا گھراٹھا ماسہ تاکہ اُسے ضرر نہ پہنچ جائے، تو یہ بھی دراصل اُسی حصے رحمت کا اثر ہے۔ مگر جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جس جامعیت کے ساتھ اللہ کی صفات کا پرتو اس پر ڈالا گیا ہے اس سے کوئی دوسری مخلوق سرفراز نہیں کی گئی۔

یہ ایک ایسا باریک مضمون ہے جس کے سمجھنے میں ذرا سی غلطی بھی آدمی کو جائے تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ صفاتِ الہی میں سے ایک حصہ پانا الوہیت کا کوئی جُزْءِا لینے کا ہم معنی ہے۔ حالانکہ الوہیت اس سے وراء الوراہ ہے کہ کوئی مخلوق اس کا ایک ادنیٰ شائبہ بھی پاسکے۔

۲۰ تقابیل کے لیے سورہ بقرہ رکوع ۴، سورہ نساء رکوع ۱۸، اور سورہ اعراف رکوع ۲ پیش نظر رہے نیز

مَسْنُونٍ ۳۳ قَالَ فَأَخْرَجَ مِنْهَا فِئْتًا رَجِيمًا ۳۴ وَإِنَّ عَلَيْكَ
 اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ۳۵ قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ
 يُبْعَثُونَ ۳۶ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۳۷ إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ
 الْمَعْلُومِ ۳۸ قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي
 الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۳۹ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ
 الْمُخْلِصِينَ ۴۰ قَالَ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ۴۱

گمارے سے پیدا کیا ہے۔ رب نے فرمایا ”اچھا تو مکمل جا یہاں سے کیونکہ تو مردود ہے، اور اب روز جزا
 تک تجھ پر لعنت ہے۔“ اُس نے عرض کیا ”میرے رب یہ بات ہے تو پھر مجھے اُس روز تک
 کے لیے مُہلت دے جبکہ سب انسان دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔“ فرمایا ”اچھا“ تجھے مُہلت ہے
 اُس دن تک جس کا وقت ہمیں معلوم ہے۔ وہ بولا ”میرے رب، جیسا تو نے مجھے بکایا اسی طرح
 اب میں زمین میں ان کے لیے دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا، سوائے تیرے اُن
 بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو۔“ فرمایا ”یہ راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے۔“

ہمارے اُن حواشی پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے جو ان مقالات پر لکھے گئے ہیں

۲۱ یعنی قیامت تک تو ملعون رہے گا، اس کے بعد جب روز جزا قائم ہوگا تو پھر تجھے تیری نافرمانیوں

کی سزا دی جائے گی۔

۲۲ یعنی جس طرح تو نے اس حقیر اور کم تر مخلوق کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر مجھے مجبور کر دیا کہ تیرا حکم نہ مانوں، اسی

طرح اب میں ان انسانوں کے لیے دنیا کو ایسا دلفریب بنا دوں گا کہ یہ سب اُس سے دھوکا کھا کر تیرے نافرمان بن جائیں گے۔

بالفاظ دیگر ابلیس کا مطلب یہ تھا کہ میں زمین کی زندگی اور اُس کی لذتوں اور اس کے عارضی فوائد و منافع کو انسان کے لیے

ایسا خوشنما بنا دوں گا کہ وہ خلافت اور اس کی ذمہ داریوں اور آخرت کی باز پرس کو بھول جائیں گے اور خود تجھے بھی یا تو فراموش

کر دیں گے، یا تجھے یاد رکھنے کے باوجود تیرے احکام کی خلاف ورزیاں کریں گے۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ
مِنَ الْغُيُوبِينَ ﴿٢٢﴾ وَإِنْ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٢٣﴾

بے شک، جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔ تیرا بس تو صرف ان بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا جو تیری پیروی کریں، اور ان سب کے لیے جہنم کی وعید ہے۔

۲۲۔ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنی وہ ہیں جو ہم نے ترجمہ میں بیان کیے ہیں اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ حَقٌّ عَلَيَّ أَنْ أُرَاهُ عَيْدٌ، یعنی یہ بات درست ہے، میں ہی اس کا پابند رہوں گا۔

۲۳۔ اس فقرے کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ میرے بندوں (یعنی عام انسانوں) پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا کہ تو انہیں زبردستی نافرمان بنا دے، البتہ جو خود ہی بہکے ہوئے ہوں اور آپ ہی تیری پیروی کرنا چاہیں انہیں تیری راہ پر جانے کے لیے تھوڑا دیا جائے گا، انہیں ہم زبردستی اس سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں گے۔

پہلے معنی کے لحاظ سے مضمون کا خلاصہ یہ ہوگا کہ بندگی کا طریقہ اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے، جو لوگ اس راستے کو اختیار کر لیں گے ان پر شیطان کا بس نہ چلے گا، انہیں اللہ اپنے لیے خالص فرمائے گا اور شیطان خود بھی اقرار ہی ہے کہ وہ اس کے پھندے میں نہ پھنسیں گے۔ البتہ جو لوگ خود بندگی سے منحرف ہو کر اپنی فلاح و سعادت کی راہ گم کر دیں گے وہ ابلیس کے نتھے چڑھ جائیں گے اور پھر جہنم جہنم فریب انہیں فریب دے کر لے جانا چاہے گا، وہ اس کے پیچھے بھٹکتے اور دوسرے دوزخ نکلتے چلے جائیں گے۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے اس بیان کا خلاصہ یہ ہوگا: شیطان نے انسانوں کو بہکانے کے لیے اپنا طریق کار یہ بیان کیا کہ وہ زمین کی زندگی کو ان کے لیے خوشنما بنا کر انہیں خدا سے غافل اور بندگی کی راہ سے منحرف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شرط ہیں نے مانی، اور مزید توضیح کرتے ہوئے یہ بات بھی صاف کر دی کہ تجھے صرف فریب دینے کا اختیار دیا جا رہا ہے، یہ اقتدار نہیں دیا جا رہا کہ تو ہاتھ پکڑ کر انہیں زبردستی اپنی راہ پر کھینچ لے جائے۔ شیطان نے اپنے نوٹس سے ان بندوں کو مستثنیٰ کیا جنہیں اللہ اپنے لیے خالص فرمائے۔ اس سے یہ غلط فہمی مترشح ہو رہی تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ بغیر کسی معقول وجہ کے یونہی جس کو چاہے گا خالص کرے گا اور وہ شیطان کی دسترس سے بچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے بلکہ بات صاف کر دی کہ جو خود بہکا ہوا ہو گا وہی تیری پیروی کرے گا۔ بالفاظ دیگر جو بہکا ہوا نہ ہو گا وہ تیری پیروی نہ کرے گا اور وہی ہمارا وہ مخصوص بندہ ہو گا جسے ہم خالص اپنا کر لیں گے۔

۲۴۔ اس جگہ یہ قصہ جس غرض کے لیے بیان کیا گیا ہے اسے بکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سیاق و سباق کو

لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِّكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ ۚ إِنَّ
 الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّتٍ وَعِيُونٌ ۖ أُدْخِلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ ۝

یہ جہنم جس کی وعید پیروان ابلیس کے لیے کی گئی ہے اس کے سات دروازے ہیں۔ ہر
 دروازے کے لیے اُن میں سے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے متقی لوگ باغوں اور
 چشموں میں ہوں گے اور اُن سے کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ ان میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر۔

واضح طور پر ذہن میں رکھا جائے۔ پہلے اور دوسرے رکوع کے مضمون پر غور کرنے سے یہ بات صاف سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس
 سلسلہ بیان میں آدم و ابلیس کا یہ قصہ بیان کرنے سے مقصود کفار کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ تم اپنے ازلی دشمن
 شیطان کے پھندے میں پھنس گئے ہو اور اُس پستی میں گرے چلے جا رہے ہو جس میں وہ اپنے حسد کی بنا پر تمہیں گرانا چاہتا ہے
 اس کے برعکس یہ نبی تمہیں اس کے پھندے سے نکال کر اُس بلندی کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا ہے جو
 دراصل انسان ہونے کی حیثیت سے تمہارا فطری مقام ہے۔ لیکن تم عجیب احمق لوگ ہو کہ اپنے دشمن کو دوست، اور اپنے خیر خواہ
 کو دشمن سمجھ رہے ہو۔

اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اسی قصہ سے اُن پر واضح کی گئی ہے کہ تمہارے لیے راہ نجات صرف ایک ہے،
 اور وہ اللہ کی بندگی ہے۔ اس راہ کو چھوڑ کر تم جس راہ پر بھی جاؤ گے وہ شیطان کی راہ ہے جو سبیدعی جہنم کی طرف
 جاتی ہے۔

تیسری بات جو اس قصے کے ذریعہ سے ان کو سمجھانی گئی ہے، یہ ہے کہ اپنی اس غلطی کے ذمہ دار تم خود ہو۔ شیطان
 کا کوئی کام اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ ظاہر حیات دنیا سے تم کو دھوکا دے کر تمہیں بندگی کی راہ سے منحرف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
 اُس سے دھوکا کھانا تمہارا اپنا فعل ہے جس کی کوئی ذمہ داری تمہارے اپنے سوا کسی اور پر نہیں ہے۔
 اس کی مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ ابراہیم آیت ۲۲ و حاشیہ نمبر ۳۱۔

۲۶ جہنم کے یہ دروازے اُن گمراہیوں اور معصیتوں کے لحاظ سے ہیں جن پہ چل کر آدمی اپنے لیے دوزخ کی راہ
 کھولتا ہے۔ مثلاً کوئی دہریت کے راستے سے دوزخ کی طرف جاتا ہے، کوئی شرک کے راستے سے، کوئی نفاق کے راستے سے،
 کوئی نفس پرستی اور فسق و فجور کے راستے سے، کوئی ظلم و ستم اور خلق آزاری کے راستے سے، کوئی تبلیغ ضلالت اور اقامت کفر
 کے راستے سے، اور کوئی اشاعت فحشاء و منکر کے راستے سے۔

۲۷ یعنی وہ لوگ جو شیطان کی پیروی سے بچے رہے ہوں اور جنہوں نے اللہ سے ڈرتے ہوئے
 عیدت کی زندگی بسر کی ہو۔

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلِيٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿۳۷﴾
 لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿۳۸﴾ نَبِيُّ
 عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۳۹﴾ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ
 الْأَلِيمُ ﴿۴۰﴾ وَنَبِّئُهُمْ عَنِ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿۴۱﴾ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ

اُن کے دلوں میں جو تھوڑی بہت کھوٹ کپٹ ہوگی اسے ہم نکال دیں گے، وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔ انہیں نہ وہاں کسی مشقت سے پالا پڑے گا اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

اسے نبی، میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں۔ مگر اس کے ساتھ میرا عذاب بھی نہایت دردناک عذاب ہے۔

اور اب میں ذرا ابراہیم کے مہمانوں کا قصہ سناؤ۔ جب وہ آئے اُس کے ہاں اور

۳۷ یعنی نیک لوگوں کے درمیان آپس کی غلط فہمیوں کی بنا پر دنیا میں اگر کچھ کدورتیں پیدا ہو گئی ہوں گی تو جنت میں داخل ہونے کے وقت وہ دور ہو جائیں گی اور ان کے دل ایک دوسرے کی طرف سے بالکل صاف کر دیے جائیں گے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ اعراف - حاشیہ نمبر ۳۲۔

۳۸ اس کی تشریح اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضور نے خبر دی ہے کہ یقال لا اهل الجنة ان لكم ان تصحوا ولا تمضوا ابداً، وان لكم ان تعیشوا فلا تموتوا ابداً، وان لكم ان تشبوا ولا تموتوا ابداً، وان لكم ان تقیموا فلا تقضوا ابداً۔ یعنی "اہل جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ اب تم ہمیشہ تندرست رہو گے، کبھی بیمار نہ پڑو گے۔ اور اب تم ہمیشہ زندہ رہو گے، کبھی موت تم کو نہ آئے گی۔ اور اب تم ہمیشہ جوان رہو گے، کبھی بڑھاپا تم پر نہ آئے گا۔ اور اب تم ہمیشہ مقیم رہو گے، کبھی کوچ کرنے کی تمہیں ضرورت نہ ہوگی۔" اس کی مزید تشریح اُن آیات و احادیث سے ہوتی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں انسان کو اپنی معاش اور اپنی ضروریات کی فراہمی کے لیے کوئی محنت نہ کرنی پڑے گی، سب کچھ اُسے بلا سعی و مشقت ملے گا۔

۳۹ یہاں حضرت ابراہیم اور ان کے بعد متصلاً تو م لوط کا قصہ جس غرض کے لیے سنایا جا رہا ہے اس کو سمجھنے

وقف لازم

فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ﴿۵۲﴾ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ ابَشِّرْهُمُونِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فِيمَا تُبَشِّرُونَ ﴿۵۴﴾ قَالُوا بِشْرُكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُن مِّنَ الْقَانِطِينَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿۵۶﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۷﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ

کہا "سلام ہو تم پر"، تو اس نے کہا "ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے"۔ انہوں نے جواب دیا "ڈرو نہیں ہم تمہیں ایک بڑے سیانے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں"۔ ابراہیم نے کہا "کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت تم مجھے دے رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا "ہم تمہیں برحق بشارت دے رہے ہیں، تم مایوس نہ ہو"۔ ابراہیم نے کہا "اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں"۔ پھر ابراہیم نے پوچھا "اے فرستادگان الہی، وہ ہم کیا ہے جس پر آپ حضرات تشریف لائے ہیں؟" وہ بولے، "ہم ایک مجرم قوم کی طرف

کے لیے اس سورۃ کی ابتدائی آیات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ آیات ۷-۸ میں کفار مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ "اگر تم سچے نبی ہو تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتے؟" اس کا مختصر جواب وہاں صرف اس قدر دے کر چھوڑ دیا گیا تھا کہ "فرشتوں کو ہم یونہی نہیں اتار دیا کرتے، انہیں تو ہم جب بھیجتے ہیں حق کے ساتھ ہی بھیجتے ہیں"۔ اب اس کا مفصل جواب یہاں ان دونوں قصوں کے پیرائے میں دیا جا رہا ہے۔ یہاں انہیں بتایا جا رہا ہے کہ ایک "حق" تو وہ ہے جسے لے کر فرشتے ابراہیم کے پاس آئے تھے، اور دوسرا حق وہ ہے جسے لے کر وہ قوم لوط پر پہنچے تھے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ تمہارے پاس ان میں سے کون سا حق لے کر فرشتے آسکتے ہیں۔ ابراہیم والے حق کے لائق تو ظاہر ہے کہ تم نہیں ہو۔ اب کیا اس حق کے ساتھ فرشتوں کو بلوانا چاہتے ہو جسے لے کر وہ قوم لوط کے ہاں نازل ہوئے تھے؟

۱۵۲ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ ہود رکوع ۷ مع حواشی۔

۱۵۳ یعنی حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت، جیسا کہ سورۃ ہود میں بصراحت بیان ہوا ہے۔

۱۵۴ حضرت ابراہیم کے اس سوال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا ہمیشہ غیر معمولی

مُجْرِمِينَ ۱۵ إِلَّا آلَ لُوطٍ ۱۶ إِنَّا لَمُنَجِّوهُمْ أَجْمَعِينَ ۱۷ إِلَّا
 امْرَأَتَهُ قَدَرْنَا ۱۸ إِنَّمَا لَبِثَ لَبِثًا جَاءَ آلَ لُوطٍ
 الْمُرْسَلُونَ ۱۹ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّكَرُّونَ ۲۰ قَالُوا بَلْ جُنُنُكَ
 بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ ۲۱ وَآتَيْنَكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۲۲
 فَاسْرِ يَا هَلِكُ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ

بھیجے گئے ہیں صرف لوط کے گھر والے مستثنیٰ ہیں ان سب کو ہم بچالیں گے، سوائے اُس کی بیوی کے جس کے لیے
 اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں شامل رہے گی یہ
 پھر جب یہ فرستاد سے لوط کے ہاں پہنچے تو اُس نے کہا ”آپ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں“
 انہوں نے جواب دیا، ”نہیں، بلکہ ہم وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں یہ لوگ شک کر رہے تھے۔
 ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ ہم حق کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں، لہذا اب تم کچھ رات رہے
 اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ تم میں سے کوئی پلٹ کر

حالات ہی میں ہوا کرتا ہے اور کوئی بڑی مہم ہی ہوتی ہے جس پر وہ بھیجے جاتے ہیں۔

۲۳ اشارے کا یہ اختصار صاف بتا رہا ہے کہ قوم لوط کے جرائم کا پیمانہ اس وقت اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ حضرت
 ابراہیم جیسے باخبر آدمی کے سامنے اس کا نام لینے کی قطعاً ضرورت نہ تھی، بس ”ایک محرم قوم“ کہہ دینا بالکل کافی تھا۔

۲۵ تقابیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ اعراف رکوع ۱۰، سورۃ ہود رکوع ۷۔

۲۶ یہاں بات مختصر بیان کی گئی ہے۔ سورۃ ہود میں اس کی تفصیل یہ دی گئی ہے کہ ان لوگوں کے آنے سے حضرت لوط
 بہت گھبرائے اور سخت دل تنگ ہوئے اور ان کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کہنے لگے کہ آج تو سخت وقت آیا ہے۔ اس گھبراہٹ
 کی وجہ جو قرآن کے بیان سے اشارۃً اور روایات سے صراحتاً معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ یہ فرشتے نہایت خوبصورت لوگوں کی شکل
 میں حضرت لوط کے ہاں پہنچے تھے اور حضرت لوط اپنی قوم کی بد معاشی سے واقف تھے، اس لیے آپ سخت پریشان ہوئے کہ ان
 ہوئے مہمانوں کو وہیں بھی نہیں کیا جاسکتا، اور انہیں ان بد معاشوں سے بچانا ہی مشکل ہے۔

۲۷ یعنی اس غرض سے اپنے گھر والوں کے پیچھے چلو کہ ان میں سے کوئی ٹھیرنے نہ پائے۔

مِنْكُمْ أَحَدٌ وَآمَضُوا حَيْثُ تُوْمَرُونَ ﴿٦٥﴾ وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ
ذَلِكَ الْأَمْرَ إِنَّ دَابِرَ هَؤُلَاءِ مَقْطُوعٌ مُصْبِحِينَ ﴿٦٦﴾ وَ
جَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٦٧﴾ قَالَ إِنَّ هَؤُلَاءِ

نہ دیکھے بس سیدھے چلے جاؤ جدھر جانے کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔ اور اُسے ہم نے اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہوتے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔

استنہ میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بیتاب ہو کر لوط کے گھر چڑھ آئے۔ لوط نے کہا "بھائیو! یہ

۲۸ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پلٹ کر دیکھتے ہی تم پتھر کے ہو جاؤ گے، جیسا کہ ہائیل میں بیان ہوا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیچھے کی آوازیں اور شور و غل سن کر تماشا دیکھنے کے لیے نہ پھیر جانا۔ یہ نہ تماشا دیکھنے کا وقت ہے اور نہ مجرم قوم کی ہلاکت پر آنسو بہانے کا۔ ایک لمحہ بھی اگر تم نے معذب قوم کے علاقے میں دم لے لیا تو بعید نہیں کہ تمہیں بھی اس ہلاکت کی بارش سے کچھ گزند پہنچ جائے۔

۲۹ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس قوم کی بد اخلاقی کس حد کو پہنچ چکی تھی۔ بستی کے ایک شخص کے ہاں چند خوبصورت مہمانوں کا آجانا اس بات کے لیے کافی تھا کہ اُس کے گھر پر اوباشوں کا ایک ہجوم اُٹھ اُٹھے اور علانیہ وہ اس سے مطالبہ کریں کہ اپنے مہمانوں کو بدکاری کے لیے ہمارے حوالے کر دے۔ اُن کی پوری آبادی میں کوئی ایسا عنصر باقی نہ رہا تھا جہاں حرکات کے خلاف آواز اُٹھاتا، اور نہ اُن کی قوم میں کوئی اخلاقی جس باقی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو علی الاعلان یہ زیادتیاں کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس ہوتی۔ حضرت لوط جیسے مقتدر انسان اور معلم اخلاق کے گھر پر بھی جب بد معاشرلوں کا حملہ اس لیے باکی کے ساتھ ہو سکتا تھا تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عام انسانوں کے ساتھ ان بستیوں میں کیا کچھ ہو رہا ہوگا۔

تسمو میں اس قوم کے جو حالات لکھے ہیں اُن کا ایک خلاصہ ہم یہاں دیتے ہیں جس سے کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوگا کہ یہ قوم اخلاقی فساد کی کس انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بیلا می مسافر اُن کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ راستہ میں شام ہو گئی اور اسے مجبوراً اُن کے شہر سدوم میں ٹھیرنا پڑا۔ اس کے ساتھ اپنا زادراہ تھا۔ کسی سے اُس نے میزبانی کی درخواست نہ کی۔ بس ایک درخت کے نیچے اتر گیا۔ مگر ایک سدومی اصرار کے ساتھ اُٹھا کر اُسے اپنے گھر لے گیا۔ رات اُسے اپنے ہاں رکھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کا گدھا اُس کے زین اور مال تنہا رستا سمیت اُٹھا دیا۔ اس نے شور مچایا۔ مگر کسی نے اس کی فریاد نہ سنی۔ بلکہ بستی کے لوگوں نے اُس کا رہا سہا مال بھی لوٹ کر اُسے نکال باہر کیا۔

صَيِّفِي فَلَا تَفْضَحُونِ ۖ ﴿٦٨﴾ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تَخْزُونِ ﴿٦٩﴾ قَالُوا أَوْلَكُم
نَهْكَ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿٧٠﴾ قَالَ هُوَ آوَاءُ بَنَاتِي إِنْ كُنْتُمْ فَعَلِينَ ﴿٧١﴾

میرے مہمان ہیں، میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو، مجھے رسوا نہ کرو، وہ بولے "کیا ہم بارہا تمہیں
منع نہیں کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کے ٹھیکے دار نہ بنو؟" لوط نے عاجز ہو کر کہا "اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے
قریب میری بیٹیاں موجود ہیں!"

ایک مرتبہ حضرت سارہ نے حضرت لوط کے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے کے لیے اپنے غلام البعیر کو سدوم بھیجا
البعیر جب شہر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک سدومی ایک اجنبی کو مار رہا ہے۔ البعیر نے اُسے شرم دلائی کہ تم یکس
مسافروں سے یہ سلوک کرتے ہو۔ مگر جواب میں سر بازار البعیر کا سر پھاڑ دیا گیا۔

ایک مرتبہ ایک غریب آدمی کہیں سے اُن کے شہر میں آیا اور کسی نے اُسے کھانے کو کچھ نہ دیا سوہ فلتے سے بد حال
ہو کر ایک جگہ گرا پڑا تھا کہ حضرت لوط کی بیٹی نے اُسے دیکھ لیا اور اس کے لیے کھانا پہنچایا۔ اس پر حضرت لوط اور ان کی بیٹی کو
سخت ملامت کی گئی اور انہیں دھکیاں دی گئیں کہ ان حرکتوں کے ساتھ تم لوگ ہماری بستی میں نہیں رہ سکتے۔

اس طرح کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد تلمود کا مصنف لکھتا ہے کہ اپنی رفقہ مرہ کی زندگی میں یہ لوگ سخت ظالم،
دھوکہ باز اور بد معاملہ تھے۔ کوئی مسافر ان کے علاقے سے بھرت نہ گزر سکتا تھا کوئی غریب ان کی بستیوں سے روٹی کا ایک ٹکڑا
نہ پاسکتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ باہر کا آدمی ان کے علاقے میں پہنچ کر فاقوں سے مر جاتا اور یہ اُس کے کپڑے تار کر اس کی لاش کو
برہنہ دفن کر دیتے۔ بیرونی تاجر اگر شامت کے مارے وہاں چلے جاتے تو برسرِ عام لوط لیے جاتے اور اُن کی فریاد کو ٹھٹھوں
میں اڑا دیا جاتا۔ اپنی وادی کو اُنہوں نے ایک باغ بنا رکھا تھا جس کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہوا تھا اس باغ میں وہ انتہائی
بے حیائی کے ساتھ غلابہ بدکاریاں کرتے تھے اور ایک لوط کی زبان کے سوا کوئی زبان ان کو ٹوکنے والی نہ تھی۔ قرآن مجید میں
اس پوری داستان کو سمیٹ کر صرف دو فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے کہ دَمِينٌ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ
(وہ پہلے سے بہت بڑے بڑے کام کر رہے تھے) اور اَلَا تَنْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ وَتَقَطُّعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ
رِقِي نَادِيَكُمْ الْمُنْكَرَ (تم مردوں سے خواہش نفس پوری کرتے ہو، مسافروں کی راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں
کلم کھلا بدکاریاں کرتے ہو؟)

۱۵۔ اس کی تشریح سورہ ہود کے مآشیہ نمبر ۸۷ میں بیان کی جا چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ

یہ کلمات ایک شریف آدمی کی زبان پر ایسے وقت میں آئے ہیں جب کہ وہ بالکل تنگ آچکا تھا اور بد معاش لوگ اس کی ساری
لڑیاد و نغاں سے بے پروا ہو کر اُس کے ہمالوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿٤٢﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ
 مُشْرِقِينَ ﴿٤٣﴾ فَجَعَلْنَا عَلَيَّهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً
 مِنْ سِجِّيلٍ ﴿٤٤﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّئِينَ ﴿٤٥﴾ وَإِنَّهَا

تیری جان کی قسم اے نبی! اُس وقت اُن پر ایک نشہ سا چڑھا ہوا تھا جس میں وہ آپے سے
 باہر ہوئے جاتے تھے۔

آخر کار پو پھٹتے ہی اُن کو ایک زبردست دھماکے نے آیا اور ہم نے اُس سستی کو تُل پٹ کر کے
 رکھ دیا اور ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی۔

اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو صاحبِ فراست ہیں۔ اور وہ علاقہ جہاں

اس موقع پر ایک بات کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ سورہ ہود میں واقعہ جس ترتیب سے بیان کیا گیا ہے اُس میں
 یہ تصریح ہے کہ حضرت لوط کو بد معاشوں کے اس حملہ کے وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ اُن کے مہمان درحقیقت فرشتے ہیں
 وہ اُس وقت تک یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ چند مسافر لڑکے ہیں جو ان کے ہاں آکر ٹھہرے ہیں۔ انہوں نے اپنے فرشتہ ہونے کی
 حقیقت اُس وقت کھولی جب بد معاشوں کا ہجوم مہمانوں کی تیا مگاہ پر پہل پڑا اور حضرت لوط نے تڑپ کر فرمایا اَلَا اَنْتَ بِكُذِّ
 قُوًّا۟ۤ اَوْ اَوْحٰی اِلٰی سَکِّیْنٍ شَدِیْدِیْنِ (کاش مجھے تمہارے مقابلے کی طاقت حاصل ہوتی یا میرا کوئی سہارا ہوتا جس سے میں
 حمایت حاصل کرتا)۔ اس کے بعد فرشتوں نے اُن سے کہا کہ اب تم اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ اور ہمیں ان
 سے نکلنے کے لیے چھوڑ دو۔ واقعات کی اس ترتیب کو نگاہ میں رکھنے سے پورا اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت لوط نے یہ الفاظ
 کس تنگ موقع پر عاجزاً کہا تھے۔ اس سورے میں چونکہ واقعات کو اُن کی ترتیب وقوع کے لحاظ سے نہیں بیان کیا جا
 رہا ہے، بلکہ اُس خاص پہلو کو خاص طور پر نمایاں کرنا مقصود ہے جسے ذہن نشین کرنے کی خاطر ہی یہ قصہ بیان نقل کیا گیا ہے،
 اس لیے ایک عام ناظر کو یہاں یہ غلط فہمی پیش آتی ہے کہ فرشتے ابتدا ہی میں اپنا تعارف حضرت لوط سے کراچکے تھے اور اب
 اپنے مہمانوں کی آبرو بچانے کے لیے اُن کی یہ ساری فریاد و نغاں محض ایک ڈرامائی انداز کی تھی۔

۱۴۷۔ یہ پکی ہوئی مٹی کے پتھر ممکن ہے کہ شہاب ثاقب کی نوعیت کے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آتش فشانی انفجار

کی بدولت زمین سے نکل کر اُڑے ہوں اور پھر اُن پر بارش کی طرح برس گئے ہوں، Volcanic eruption

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سخت آندھی نے یہ پتھرا ڈکے ہوئے۔

لِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ ﴿۴۶﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿۴۷﴾ وَإِن كَانَ
 أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ﴿۴۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لِيَآمَامٍ
 مُّبِينٍ ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسِلِينَ ﴿۵۰﴾ وَآتَيْنَاهُم
 آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿۵۱﴾ وَكَانُوا يُخِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ يَوُوتًا

یہ واقعہ پیش آیا تھا، گزرگاہ عام پر واقع ہے، اُس میں سامانِ عبرت ہے اُن لوگوں کے لیے جو
 صاحبِ ایمان ہیں۔

اور ایکہ والے ظالم تھے، تو دیکھ لو کہ ہم نے بھی اُن سے انتقام لیا، اور ان دونوں قوموں کے
 اُجڑے ہوئے علاقے کھلے راستے پر واقع ہیں۔ ع

حجر کے لوگ بھی رسولوں کی تکذیب کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات اُن کے پاس بھیجیں، اپنی
 نشانیاں اُن کو دکھائیں، مگر وہ سب کو نظر انداز ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑ تراش تراش کر مکان بناتے تھے

۴۶ یعنی حجاز سے شام، اور عراق سے مصر جاتے ہوئے یہ تباہ شدہ علاقہ راستہ میں پڑتا ہے اور عموماً قافلوں کے
 لوگ تباہی کے اُن آثار کو دیکھتے ہیں جو اس پورے علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ یہ علاقہ بحر لوط (بحیرہ مروار کے مشرق اور
 اور جنوب میں واقع ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے جنوبی حصے کے متعلق جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ یہاں اس درجہ
 یہاں پانی پائی جاتی ہے جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی۔

۴۷ یعنی حضرت شعیب کی قوم کے لوگ۔ اس قوم کا نام بھی مدین تھا۔ مذہب اُن کے مرکزی شہر کو یہی کہتے تھے اور
 اُن کے پورے علاقے کو بھی۔ رہا ایکہ، تو یہ تبوک کا قدیم نام تھا۔ اس لفظ کے لغوی معنی گھنے جنگل کے ہیں۔ آج کل ایک ایک
 پہاڑی نالے کا نام ہے جو جبل اللوز سے وادی اقل میں آکر گرتا ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو الشعراء، مائتہ ۱۱۵)

۴۸ مدین اور اصحاب الایکہ کا علاقہ بھی حجاز سے فلسطین و شام جاتے ہوئے راستے میں پڑتا ہے۔
 ۴۹ یہ قوم ثمود کا مرکزی شہر تھا۔ اس کے کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العلماء سے چند میل کے
 فاصلہ پر واقع ہیں۔ مدینہ سے تبوک جاتے ہوئے یہ مقام شاہ راہ عام پر ملتا ہے اور قافلے اس وادی میں سے ہو کر گزرتے
 ہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا۔ آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ کو جاتے

اٰمِنِيْنَ ۝۸۴ فَاخَذَتْهُمْ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ۝۸۴ فَمَا اَعْنٰی عَنْهُمْ
مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸۴ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا
بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ ۙ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ
الْجَمِيْلَ ۝۸۵ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيْمُ ۝۸۶ وَاَلْقَدُ اٰتِيْنَاكَ سَبْعًا

اور اپنی جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن تھے۔ آخر کار ایک زبردست دھماکے نے ان کو صبح ہوتے آیا اور ان کی کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی۔

ہم نے زمین اور آسمان کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا ہے اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے پس اے محمدؐ تم ان لوگوں کی بیہودگیوں پر (شریفانہ درگزر سے کام لو یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے رکھی

ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں سُرخ رنگ کے پہاڑوں میں قوم ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انہوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں۔ ان کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہوں۔ ان مکانات میں اب بھی سڑی گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ اعراف حاشیہ نمبر ۵۷) ۝۸۶ یعنی ان کے وہ سنگین مکانات جو انہوں نے پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائے تھے ان کی کچھ بھی حفاظت نہ کر سکے۔

۝۸۷ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین و تسلی کے لیے فرمائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت بظاہر باطل کا جو غلبہ تم دیکھ رہے ہو اور حق کے راستے میں جن مشکلات اور مصائب سے تمہیں سابقہ پیش آرہا ہے، اس سے گھبراؤ نہیں۔ یہ ایک عارضی کیفیت ہے، مستقل اور دائمی حالت نہیں ہے۔ اس لیے کہ زمین و آسمان کا یہ پورا نظام حق پر تعمیر ہوا ہے نہ کہ باطل پر۔ کائنات کی فطرت حق کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے نہ کہ باطل کے ساتھ۔ لہذا یہاں اگر قیام و دوام ہے تو حق کے لیے ہے نہ کہ باطل کے لیے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ابراہیم حاشی ۲۵-۲۶-۲۷ تا ۳۹)

۝۸۸ یعنی خالق ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی مخلوق پر کامل غلبہ و تسلط رکھتا ہے کسی مخلوق کی یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کی گرفت سے بچ سکے۔ اور اس کے ساتھ وہ پوری طرح باخبر بھی ہے، جو کچھ ان لوگوں کی اصلاح کے لیے تم کر رہے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے اور جن تھکنڈوں سے یہ تمہاری سعی اصلاح کو ناکام کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں ان کا بھی اسے علم ہے۔ لہذا تمہیں گھبرانے

مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمِ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنِيَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْتَابِهِ
 أَزْوَاجًا مِنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۸﴾

ہیں جو بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں اور تمہیں قرآن عظیم عطا کیا ہے۔ تم اس متاع دنیا کی طرف
 آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے اور نہ ان کے حال پر
 اپنا دل کڑھاؤ۔ انہیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو اور (نہ ماننے والوں سے)

اور بے صبر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مطمئن رہو کہ وقت آنے پر ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق فیصلہ چکا دیا جائے گا۔

۸۷ یعنی سورۃ فاتحہ کی آیات۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے مراد وہ سات بڑی بڑی سورتیں بھی لی ہیں جن میں دو
 دوسو آیتیں ہیں، یعنی البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف اور یونس، یا انفال و توبہ۔ لیکن سلف کی اکثریت اس
 پر متفق ہے کہ اس سے سورۃ فاتحہ ہی مراد ہے۔ بلکہ امام بخاری نے دو مرفوع روایتیں بھی اس امر کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ
 خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سبع من المثانی سے مراد سورۃ فاتحہ بتائی ہے۔

۸۸ یہ بات بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی تسکین و تسلی کے لیے فرمائی گئی ہے۔ وقت وہ تھا
 جب حضور اور آپ کے ساتھی سب کے سب انتہائی خستہ حالی میں مبتلا تھے۔ کارِ نبوت کی عظیم ذمہ داریاں نبھاتے ہی حضور
 کی تجارت قریب قریب ختم ہو چکی تھی اور حضرت خدیجہ کا سرمایہ بھی دس بارہ سال کے عرصے میں خرچ ہو چکا تھا۔ مسلمانوں
 میں سے بعض کم سن نوجوان تھے جو گھروں سے نکال دیے گئے تھے، بعض صنعت پیشہ یا تجارت پیشہ تھے جن کے کاروبار
 معاشی مقاطعہ کی مسلسل ضرب سے بالکل بیٹھ گئے تھے، اور بعض بیچارے پہلے ہی غلام یا موالی تھے جن کی کوئی معاشی حیثیت نہ تھی۔
 اس پر مزید یہ ہے کہ حضور سمیت تمام مسلمان تھے اور اطراف و نواح کی بستیوں میں انتہائی مظلومی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔
 ہر طرف سے مطعون تھے، ہر جگہ تذلیل و تحقیر اور تضحیک کا نشانہ بنے ہوئے تھے، اور قلبی و روحانی تکلیفوں کے ساتھ جسمانی
 اذیتوں سے بھی کوئی بچا ہوا نہ تھا۔ دوسری طرف سردارانِ قریش دنیا کی نعمتوں سے مالا مال اور ہر طرح کی خوشحالیوں میں
 مگن تھے۔ ان حالات میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم شکستہ خاطر کیوں ہوتے ہو، تم کو تو ہم نے وہ دولت عطا کی ہے جس کے مقابلہ
 میں دنیا کی ساری نعمتیں بیچ ہیں۔ رشک کے لائق تمہاری یہ علمی و اخلاقی دولت ہے نہ کہ ان لوگوں کی مادی دولت جو طرح
 طرح کے حرام طریقوں سے کمایا ہے۔ اور طرح طرح کے حرام راستوں میں اس کمائی کو اڑا رہے ہیں اور آخر کار بالکل
 مفلس و فلاح ہو کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہونے والے ہیں۔

۸۹ یعنی ان کے اس حال پر نہ کہہ دو کہ اپنے خیر خواہ کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں، اپنی گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں

کو اپنی خوبیاں سمجھے بیٹھے ہیں، خود اس راستے پر جا رہے ہیں اور اپنی ساری قوم کو اس پر لیے جا رہے ہیں جس کا یقینی

وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿۸۹﴾ كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ﴿۹۰﴾
 الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ﴿۹۱﴾ فَوَسَّيْنَاكَ لَنَسَلْتَهُمْ
 أَجْبَعِينَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۳﴾ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ
 أَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿۹۴﴾ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ﴿۹۵﴾
 الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۹۶﴾

کہہ دو کہ میں تو صاف صاف تنبیہ کرنے والا ہوں۔ یہ اُسی طرح کی تنبیہ ہے جیسی ہم نے ان تفرقہ پر داروں
 کی طرف بھیجی تھی جنہوں نے اپنے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے۔ تو قسم ہے تیرے رب کی، ہم ضرور
 ان سبے پوچھیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

پس اے نبی، جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اُسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں
 کی ذرا پروا نہ کرو۔ تمہاری طرف سے ہم ان مذاق اُڑانے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں جو اللہ کے
 ساتھ کسی اور کو بھی خدا قرار دیتے ہیں۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

انجامِ ہلاکت ہے، اور جو شخص انہیں سلامتی کی راہ دکھا رہا ہے اُس کی سچی اصلاح کو ناکام بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور
 صرف کیسے ڈالتے ہیں۔

۵۲ اس گروہ سے مراد یہود ہیں۔ ان کو مُقْتَسِمِينَ اس معنی میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے دین کو تقسیم کر ڈالا،
 اس کی بعض باتوں کو مانا، اور بعض کو نہ مانا، اور اس میں طرح طرح کی کمی و بیشی کر کے بیسیوں فرقے بنا لیے۔ ان کے ”قرآن“ سے
 مراد توراہ ہے جو ان کو اُسی طرح دی گئی تھی جس طرح اُمتِ محمدیہ کو قرآن دیا گیا ہے۔ اور اس ”قرآن“ کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے
 سے مراد وہی فعل ہے جسے سورہ بقرہ آیت ۸۵ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ أَفْتَوْا مُنُونًا بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَكُفَرُوا بِ
 بَعْضِهِ دَكَاةً وَمَا يَكْفُرُونَ إِلَّا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْبَاطِلِينَ ﴿۸۵﴾۔ پھر یہ جو فرمایا کہ یہ تنبیہ جو آج تم کو کی
 جا رہی ہے یہ ویسی ہی تنبیہ ہے جیسی تم سے پہلے یہود کو کی جا چکی ہے، تو اس سے مقصود دراصل یہود کے حال سے عبرت
 دلانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے خدا کی بھیجی ہوئی تنبیہات سے غفلت برت کر جو انجام دیکھا ہے وہ تمہاری آنکھوں
 کے سامنے ہے۔ اب سوچ لو، کیا تم بھی یہی انجام دیکھنا چاہتے ہو؟

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ﴿۹۶﴾ فَسَبِّحْ
 بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ ﴿۹۷﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ
 حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ﴿۹۸﴾

ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجالاؤ، اور اُس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔ ع

۵۲ یعنی تبلیغ حق اور دعوتِ اصلاح کی کوششوں میں جو تکلیفوں اور مصیبتوں سے تم کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے کی طاقت اگر تمہیں مل سکتی ہے تو صرف نماز اور بندگی رب پر استقامت سے مل سکتی ہے۔ یہی چیز تمہیں تسلی بھی دے گی، تم میں صبر بھی پیدا کرے گی، تمہارا حوصلہ بھی بڑھا دے گی، اور تم کو اس قابل بھی بنا دے گی کہ دنیا بھر کی گالیوں اور مذمتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں اُس خدمت پر ڈٹے رہو جس کی انجام دہی میں تمہارے رب کی رضا